THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو کے رجحان ساز افسانہ نگار

TRENDSETTING URDU FICTION WRITERS IN THE CONTEXT OF THE 21ST CENTURY

محمد عرفان

پی ایچ ڈی اسکالر، نیشنل کالج آف بزنس ایڈ منسٹریشن اینڈ اکنامکس سب کیمپس بہاولپور

ڈاکٹر عامرہ رسول

شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈ منسٹریشن اینڈ اکنامکس سب کیمپس بہاولپور

Abstract

A trend has the property of influencing and being influenced, and when this property reaches its peak, the trend or inclination gradually begins to take the form of a movement. Generally, a trend has no purpose and is a kind of mental and intellectual wave that makes its way in content and subject, style and manner. A trend generally moves in the direction of deviation, change and development, but if someone does not want to turn it towards destruction, it can also die in this direction. A trend does not arise under any particular thought and attitude, but arises as a requirement of circumstances. The simplest and most understandable definition of a trend can be given in these words that when one or more people start thinking and writing in the same way about a thought or form, that trend begins to be called a trend. The literature of all languages of the world is the cradle of different trends and inclinations. Urdu literature also has its similarities. For example, the trend of feminism in Lucknow poetry, the trend of sad ghazals and satire in Delhi, the trend of describing supernatural events in stories, the trend of using English words in the latter half of the nineteenth century, etc. These types of relatively less important trends continue to exist in language and literature

.

اردو زبان و ادب میں رجحان یا میلان کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے تو واضح ہے کہ یہ انگریزی لفظ Trend کے معنی میں مستعمل ہے۔ البتہ اپنی کیفیت اور معیار کے لحاظ سے یہ لفظ اردو میں بہت زیادہ واضح نہیں ہے۔ لہٰذا اردو کے ادبی رجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر غور و خوض کر لیا جائے کہ رجحان اور اس کے عوامل کیا ہیں۔

رجحان کیا ہے:

رجحان دراصل تبدیلی اور تغیر کے اتباع کی ایک شکل ہے۔ انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ لمبے عرصے تک یکسانیت اور یک رنگی کو قبول نہیں کرتی لہٰذا تغیر اور تبدل کی خواہش انسانی فطرت کا جز قرار پاتی ہے۔ تغیر کی یہ خواہش محض عام افراد تک محدود رہے تو اسے زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا لیکن اس خواہش کی تکرار شعوری اور لاشعوری طور پر عوام کے کچھ حلقوں خصوصاً فنون لطیفہ سے وابستہ افراد اور ادبا و شعرا کی تخلیقات میں پیدا ہونے لگے تو اسے بالعموم رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب میں رجحان یا میلان انگریزی لفظ Trend کا مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس کا مفہوم واضح ہے۔ جبکہ کیفیت کے اعتبار سے یہ لفظ ایک خاص ذہنی رویے، ایک مخصوص نہج اور ایک الگ اسلوب اور طرز کی ابتدا اور اس کے پھیلنے سے عبارت ہے۔ دراصل رجحان ایک غیر شعوری ذہنی رویہ ہوتا ہے جو کسی فرد اور گروپ میں منصوبہ بندی اور ابلاغ و تشہیر کے بغیر بھی پنپ سکتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر انور سدید نے رجحان کے تعلق سے تحریر کیا ہے کہ:

> "رجحان دراصل ایک خیال یا اشارہ ہوتا ہے اور اس قت تک فروغ نہیں پاتا جب تک یہ خیال یا اشارہ دوسرے ادبا کو ہمدردانہ طور پر اپنی طرف متوجہ کرانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ قدیم ادب میں کئی ایسے رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جو بڑے کروفر کے ساتھ سامنے آئے لیکن ادب کو زیادہ عرصے تک متاثر نہ کرسکے اور مستقبل پر اپنے دیرپا نقوش مرتسم کیے بغیر

ہی مٹ گئے۔ اس کے برعکس جن رجحانات میں زندگی، توانائی اور اجتہاد کی قوت موجود تھی وہ نہ صرف جلدی مقبول ہو گئے بلکہ پہلے ان کی تقلید تخلیقی سطح پر ہوئی اور پھر وسعت ملتے ہی ایک ادبی تحریک کو کروٹ دینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔"(1)

رجحان میں متاثر کرنے اور متاثر ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے اور جب یہ خاصیت اپنے نقطہ عروج پر پہنچتی ہے تو رجحان یا میلان دھیرے دھیرے تحریک کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ عموماً رجحان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا اور یہ ایک طرح کی ذہنی اور فکری ترنگ ہوتی ہے جو مواد اور موضوع، طرز اور اسلوب میں اپنی راہ بنا لیتی ہے۔ رجحان عمومی طور پر انحراف، تبدیلی اور ترقی کی سمت بڑھتا ہے لیکن کوئی اسے تخریب کی جانب موڑنا چاہے تو اس سمت بھی مڑ سکتا ہے۔ رجحان کسی خاص فکر اور رویہ کے تحت نہیں پیدا ہوتا بلکہ حالات کے تقاضے کے طور پر جنم لیتا ہے۔ رجحان کی سب سے آسان اور قابل فہم تعریف ان لفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ جب کسی فکر یا ہیئت کے تعلق سے ایک یا ایک سے زیادہ افراد ایک ہی انداز میں سوچنے اور لکھنے لگ جاتے ہیں تو وہ رجحان کہلانے لگتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کا ادب مختلف رجحانات و میلانات کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی اس کی ہماہمی ہے۔ مثلاً لکھنو کی شاعری میں نسائیت کا رجحان، دہلی میں حزنیہ غزل گوئی اور ہجویہ شاعری کا رجحان، داستانوں میں مافوق الفطرت واقعات کے بیان کا رجحان، انیسوی صدی کے نصف آخر میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان وغیرہ۔ اس قسم کے نسبتاً کم اہم رجحانات زبان اور ادب میں جاری وساری رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رجحانات ایسے بھی ہوتے ہیں جو آگے چل کر زبان و ادب کے لیے بڑے دور رس نتائج کے حامل بنتے ہیں۔ مثلاً مقفی و مسجع عبارت آرائی کا رجحان، رومانوی طرزِ تحریر کا رجحان، سلیس و سادہ نثر نگاری کا رجحان، ہیئتی تجربوں کا رجحان، ادبی تحریروں میں وطنیت و قومیت کا رجحان، موضوع واصناف کے احیا کا رجحان، ادب لطیف کا رجحان، افسانوں میں حقیقت نگاری کا رجحان اور ابہام واشکال اور جدیدت کا رجحان، مابعد جدیدیت کا رجحان وغیرہ۔

رجحانات عموماً شخصی اجتہادات مختلف سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی رویوں اور حالات کے دباؤ یا تقاضوں کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں بعض رجحان مقبول ہوتے ہیں اور بعض استبداد زمانہ کے ہاتھوں فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ دراصل رجحان اگر کسی نئے افق کو روشن نہ کر سکے تو محض ادیب کی ذات میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کا دائرہ اثر محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو رجحانات کے چند افسانہ نگاروں کی مختصر تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

اسد محمد خان:

اسد محمد خان آفریدی اور کزئی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے میاں عزت خاں کے یہاں بھوپال میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد بھوپال کے ایک مقامی اسکول میں مصوری کے استاد تھے اور شانتی نکیتن کے تربیت یافتہ تھے۔ اسد محمد خاں کی والدہ منور جہاں، میرزا غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں کی پوتی تھیں۔ بانی ریاست بھوپال سردار دوست محمد خاں نویں پیڑھی میں اسد محمد خاں کے جد ہیں جو ۱۷۰۳ء میں مالوہ، بندیل کھنڈ میں وارد ہوئے تھے۔ اسد محمد خان اپنی ادبی زندگی اور افسانہ نگاری کے حوالے سے خود لکھتے ہیں کہ:

"خود میں اور میرے ساتھ ایک پٹا ہوا آدمی۔۔۔ وہ کہیں کا بھی ہو، کسی سے بھٹکتا ہوا میری طرف آیا ہو۔۔۔ میری لکھت کا محور ہے"۔(2)

اسد محمد خاں نے شاہجہانی ماڈل اسکول، بھوپال سے میٹرک کی تعلیم ۱۹۴۹ء میں مکمل کی اور حمیدیہ کالج بھوپال میں داخلہ لیا لیکن چند ماہ بعد ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے تنہا پاکستان ہجرت کی۔ نامساعد حالات میں ۱۹۵۲ء میں جناح کالج، کراچی سے انٹر اور سندھ مسلم آرٹس کالج جو کہ کراچی یونیورسٹی سے منسلک تھا سے بی اے کی سند حاصل کی۔ پاکستان ہجرت کرنے سے قبل جے جے اسکول آف آرٹ ممبئی سے کمرشیل آرٹ میں ڈپلوما بھی مکمل کیا تھا۔

اسد محمد خاں سترہ برس کی عمر میں حمیدیہ کالج، بھوپال کے زمانہ طالب علمی میں بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر سترہ دن جیل میں گزارے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ تن تنہا بھوپال سے لاہور چلے گئے۔ اُن سے پہلے اُن کے بڑے بھائی پاکستان ہجرت کر چکے تھے اور مرے کالج، سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔

لاہور پہنچ کر ریلوے ٹریننگ اسکول، والٹن، لاہور سے ایک سالہ تربیت کے بعد پاکستان ویسٹرن ریلوے میں بطور اسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ملازمت کا آغاز کیا۔ لیکن حیدر آباد، سندھ میں علاقائی حالات سازگار نہ پا کر انھوں نے یہ نوکری چھوڑ دی اور کراچی کا رخ کیا اور بطور کمرشیل آرٹسٹ روزنامہ "احسان سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے لیے انھوں نے کارٹون بنائے۔ یہ ملازمت بھی بہت زیادہ نہ قائم رہ سکی اور اسد محمد خاں نے ٹریول ایجنٹ اور ریڈیو نیوز ریڈر کے طور پر بھی کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد

کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریفک ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت ملی تو کچھ آرام بھی ملا اور یہاں انھوں نے جم کر ملازمت بھی کی۔ یہیں سے وہ بطور انسپکٹر درآمدات جون ۱۹۹۲ء میں ریٹائر بھی ہوئے۔

۱۹۶۵ء سے جز وقتی طور پر ریڈیو پاکستان، کراچی اور پاکستان کے سرکاری ٹی وی چینل پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور گیت لکھ رہے ہیں۔ ڈراموں میں شیر شاہ سوری اور گیتوں میں موج بڑھے یا آندھی آئے دیا جلائے رکھنا ہے،"زمیں گودرنگ سے امنگ سے بھری رہے، تم سنگ نیناں لاگے، مانے ناہیں جیارا پاکستان میں بہت مقبول ہوئے۔ ایک زمانے تک ان کی شناخت گیت نگاری اور نظم نگاری کے حوالے سے تھی۔ ۱۹۷۱ء میں افسانہ "باسودے کی مریم شائع ہوا تو مین اسٹریم کے افسانہ نگار تسلیم کر لیے گئے۔

اسد محمد خاں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی آبائی وطن بھوپال میں ۱۹۶۲ء میں ہوئی لیکن یہ برقرار نہ رہ سکی۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا ہے جو بنگلور میں کمپیوٹر انجینئر ہے۔ ۱۹۶۵ء میں دوسری شادی انھیں کی ایک کزن فرزانہ سے ہوئی جن سے تین بیٹیاں ہیں۔

نثر لکھنے کا آغاز خاکہ نگاری سے کیا، جو اسکول میگزین کا حصہ بنا۔ مہاتما گاندھی کی موت پر ایک نثری نوحہ لکھا تھا۔ ان کی کمرشل رائٹنگ جس پر ادبیت غالب تھی انھیں افسانہ نگاری کی جانب کھینچ لائی۔ دوستوں نے اس میدان میں طبع آزمائی کا مشورہ دیا۔ ۳۴ برس کی عمر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ پہلا افسانہ "باسودے کی مریم "اتنا تھا ہوا اور جان دار تھا کہ ان کی دھوم مچ گئی۔ یہ فنون میں ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا۔ دراصل ایک ادبی نشست میں احمد ندیم قاسمی کے سامنے یہ افسانہ پڑھا تھا۔ اُنھوں نے سراہا اور فوراً فنون کے لیے طلب کر لیا۔

افسانہ "منی دادا" بھی فنون کی زینت بنا۔ پھر تو ایک سلسلہ چل نکلا۔ یادگار افسانے قلم سے نکلتے چلے گئے۔ تاریخ ہند میں شیر شاہ سوری کی کاوشوں کے معترف ہیں۔ اُس عہد کی بابت تحقیق کر کے نو افسانے اس زمانے سے متعلق لکھے۔

۱۹۸۲ء میں پہلی کتاب "کھڑکی بھر آسمان" (افسانے نظمیں) شایع ہوئی۔ افسانوی مجموعے "برج خموشاں" ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اشاعت کا خود انتظام کیا۔ فروخت سے کچھ منافع بھی ہوا۔ پھر افسانوی مجموعہ "غصے کی نئی فصل" (۱۹۹۷ء) منصہ شہود پر آیا۔ رکے ہوئے۔" ہوئے ساون" (۱۹۹۷ء) گیتوں کا مجموعہ تھا۔ کتاب "نربدا اور دوسری کہانیاں" ۲۰۰۳ء میں شایع ہوئی۔ اُس وقت تک تحریر کردہ افسانے "جو کہانیاں لکھیں" (۲۰۰۶ء) کے نام سے چھپے۔ اسی میں ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی کے زیر عنوان سفر نامے اور دیگر تحریر میں شامل تھیں۔ پھر تیسرے پہر کی کہانیاں (۲۰۰۶ء) اور ایک ٹکڑا دھوپ کا کی اشاعت عمل میں آئی۔

حیران کن افسانے لکھنے والے اسد محمد خاں فکشن نگاروں میں عزیز احمد اور نیر مسعود کے مداح ہیں۔ نیر مسعود کی نثر پڑھ کر خود کو حالت وجد میں پاتے ہیں۔ موجودہ مراٹھی ادب کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سینئرز میں یگانہ اور موجودہ عہد کے شعرا میں ذیشان ساحل پسند ہیں۔ ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کی بابت ان کا خیال ہے کہ قرۃ العین ایک پورا عہد ہیں، بڑے سے بڑا نقاد اردو ادب میں اُن کی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بیرونی ادب میں بورخیس اور مارک ٹوئن پسند ہیں۔ دونوں کی تخلیقات کا ترجمہ بھی کیا۔ دراصل وہ اردو میں میجک ریلزم کے رجحان کو آگے بڑھانے والے افسانہ نگار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

آصف فرخی:

آصف فرخی کا تعلق اردو افسانے کی تازہ تر نسل سے ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو کراچی میں معروف محقق اور نقاد اسلم فرخی کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر ایم بی بی ایس تک کی تعلیم کراچی میں ہی حاصل کی۔ بوسٹن، امریکہ سے پبلک ہیلتھ کے شعبے میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ فی الحال اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو سے منسلک ہیں۔ آصف فرخی افسانہ نگار کے علاوہ مترجم اور مدیر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ معروف جرمن فکشن نگار ہرمن ہیسے کے ناول "سدھارت کا ترجمہ آصف فرخی نے اس نام سے کیا تھا۔ آصف کے اس ترجمے کو ہندوپاک میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ آصف فرخی کے بعد اس ناول کا ترجمہ ہندوستان سے یعقوب یاور نے بھی کیا تاہم آصف کے ترجمے کو اُس پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جدید روسی ادب کے بعض شاہکار تخلیقات کے ترجمے کیے ہیں۔ غیر افسانوی نثر میں جوہری ہتھیاروں کے خلاف اُن کی مرتب کردہ کتاب "جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں برصغیر میں بہت معروف ہوئی۔ یہ کتاب ہندوپاک کے جوہری دھماکوں کے تجربے کے رد عمل کے طور پر پیش کی گئی تھی۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY
ISSN P : 3006-3329
ISSN E : 3006-3337
Vol.4 No.1 2026

آصف فرخی کی ادارت میں کراچی سے ایک معیاری جریدہ دنیازاد کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کی پذیرائی اس جریدہ کا اختصاص ہے۔ ہندوپاک کے ممتاز لکھنے والوں کی تحریر میں اس جریدے میں شائع ہوتی ہیں۔ دنیازاد کا فلسطین کے حوالے سے خصوصی شمارہ عاشق من الفلسطین، مشہور ہوا تھا۔

آصف فرخی کے اب تک ۶ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان افسانوی مجموعوں میں شامل ان کے افسانوں کی کل تعداد ۱۱۱ ہے۔ جبکہ ان کے ۶ افسانے ایسے بھی ملتے ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ اس طرح آصف فرخی کے افسانوں کی کل تعداد ۱۱۷ ہو جاتی ہے۔

آصف فرخی کا پہلا افسانوی مجموعہ "آتش فشاں پر کھلے گلاب" تھا۔ جو ۱۹۸۲ء میں طارق پبلی کیشنز کراچی کے ذریعے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں سولہ افسانے ہیں۔ جبکہ ساتواں دن کے عنوان مصنف کا تحریر کردہ دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں شامل سولہ افسانوں میں رات کی رانی، غزال رمیدہ یادوں کے پردیس اور شرم الشیخ کو اردو دنیا میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آصف کا دوسرا مجموعہ ۱۹۸۴ء میں احسن مطبوعات، کراچی نے شائع کیا۔ اس مجموعے کا نام اسم اعظم کی تلاش تھا۔ اس میں کل چوبیں افسانے شامل تھے۔ افسانہ گلاب کے بغیر تائی کو افسانہ نگار نے سوانح رقم کرنے کی تکنیک میں تحریر کیا ہے۔ جبکہ اس مجموعے کے بیشتر افسانے تکلیجی انداز سے رقم کیے گئے ہیں۔ مثلاً کوفے کا شہری، یزید کی پیاس، حکایت نیند سے واپس آنے والوں کی وغیرہ۔ آصف فرخی کا تیسرا مجموعہ چیزیں اور لوگ تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۱ء میں احسن مطبوعات، کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس مجموعے کا افسانہ "جو تک" بہت مشہور ہوا تھا۔ چوتھا مجموعہ "شہر بیتی" ۱۹۹۵ء میں مکتبہ دانیال، کراچی نے شائع کیا۔ اس میں کل میں افسانے شامل تھے۔ پانچواں مجموعہ فضلی سنز، کراچی نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں کل سولہ افسانے تھے۔ چھٹا افسانوی مجموعہ "میرے دن گزر رہے ہیں ۲۰۰۹ء میں مکتبہ شہرزاد، کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس میں کل ہیں افسانے شامل تھے۔

ہاجرہ مسرور:

ہاجرہ مسرور کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں لکھنو میں ہوئی۔ ان کے والد پیشے سے ڈاکٹر تھے لیکن کم عمری میں ہی وہ داغ مفارقت دے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد ہاجرہ کے خاندان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس دور میں وہ سانس لے رہی تھیں، وہ بہت ہی پر آشوب اور ہنگامی تھا۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد ہندوستان کو آزادی کی دیوی تو نصیب ہوئی لیکن ساتھ ہی تقسیم کی کلہاڑی بھی اس کے سینے پر چلے بغیر نہ رہ سکی۔ ہاجرہ تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ وہاں چند مہینوں کی دردر کی ٹھوکرے کھانے کے بعد احمد ندیم قاسمی کے سہارے لاہور میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئیں۔ احمد ندیم قاسمی سے ان کے گھریلو مراسم بہت گہرے تھے۔ وہ ندیم صاحب کی منھ بولی بہن تھیں اور ان کے ساتھ مل کر انہوں نے "نقوش" کی ادارت بھی کی۔

افسانے کی تخلیق میں ہاجرہ مسرور نے اپنے عہد و ماحول سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ وہ جس دور میں لکھ رہیں تھیں اس عہد میں چند ایسے موضوعات افسانوی متن میں جذب ہو رہے تھے جو نہ صرف وقت کی ضرورت تھے بلکہ افسانے کا پورا دار و مدار انہیں موضوعات کے گرد طواف کر رہا تھا۔ ابتدائی عہد میں ہاجرہ نے زیادہ تر ٹین ایج لڑکیوں اور عورتوں کے عشق و رومان کی کہانیاں لکھیں لیکن اس میں بھی انفرادیت اس طرح برقرار رکھی کہ ان رومانی افسانوں میں انہوں نے عورت کے جذبات و احساسات اور معاشرے میں ہو رہی اس کے ساتھ بے مروتی کو پیش بھی کیا۔ بعد میں آگے چل کر انہوں نے بدلتے ہوئے ماحول اور اس عہد میں لکھے جا رہے دیگر موضوعات کو فنکاری سے قلم بند کیا اور تقسیم کے بعد پاکستان جا کر نئے موضوعات کا انتخاب کر کے اچھے اور معیاری افسانے لکھے۔ ہاجرہ کے فن میں بہت کم مدت میں ہی پختگی پیدا ہوئی اور جب وہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آئیں تو بہ قول احمد ندیم قاسمی:

> "جب وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور آئیں تو ہاجرہ کے افسانوں کے دو مجموعے چرکے اور ہائے اللہ شائع ہو چکے تھے اور ہاجرہ کا شمار اردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہو رہا تھا جنہوں نے اردو فکشن کو زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے نئے امکانات اور وسعتوں سے روشناس کرایا تھا"۔(3)

ہاجرہ مسرور کا نام اردو کے ان افسانہ نگاروں کی فہرست سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ چنانچہ افسانوی روایت میں ان کا نام اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے یہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں معاشرے کا تجربہ ملتا ہے۔ ان کے ابتدائی دو مجموعے چرکے اور

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.1 2026

ہائے اللہ کی اشاعت ہندوستان میں ہوئی جبکہ بعد کے چار مجموعے "چوری چھپے اندھیرے اجالے تیسری منزل اور چاند کی دوسری طرف پاکستان سے شائع ہوئے۔ اس لئے بعد کے مجموعوں میں وہاں کی تہذیب و معاشرت اور ماحول کا عکس بہت نمایاں ہاجرہ مسرور ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھیں۔ اس لئے انہوں نے کبھی اپنے عہد و ماحول سے چشم پوشی نہیں کی۔ انہوں نے جس دور میں شعور کی آنکھیں کھولیں وہ ہندوستانی تاریخ کا افرا تفری کا زمانہ تھا۔ ملک انگریزوں کا غلام تھا۔ سماج سے لے کر سیاست تک کے پورے نظام میں ایک اکتاہٹ اور بے چینی پیدا ہو چکی تھیں۔ چونکہ کوئی بھی فنکار اپنے عہد و ماحول سے الگ ہو کر سانس نہیں لیتا نہ ہی کسی فنکار کے فن کو اس کے ماحول سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہے۔ اور ہاجرہ کا عہد تو انتازر خیر اور ہنگامہ خیز تھا کہ اس دور میں سانس لے رہے ہر ادیب اس سے متاثر تھے۔ چنانچہ اس دور میں ترقی پسند تحریک ادیبوں کی رہنمائی کے لئے ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئی جس کی حمایت اردو کے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح ہاجرہ مسرور نے بھی کی۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے۔ اگرچہ ان کے ترقی پسند موضوعات میں شدت پسندی کے عناصر نہیں اُبھرتے تاہم انہوں بعض ایسے افسانے ضرور تخلیق کئے جن میں براہ راست سماج، معاشرے اور اس میں سانس لے رہے افراد کی جیتی جاگتیں تصویر میں ابھرتیں ہیں بلکہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کے ناطے غلط اور منفی رواج اور رویوں پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ اس نہج کے افسانوں میں "راجہ ہل سند باد جہازی کا نیا سفر پر انا مسیح سجدۂ شکر، وغیرہ اہم ہیں۔ جنس کے موضوع پر ہاجرہ نے کتنے جیسا لازوال افسانہ لکھا جس میں انہوں نے پورے معاشرے کو سمیٹ لیا۔ فرد کی جنسی ارتعاش اور جنسی گھٹن کو واضح کرنے کے لئے تل اوٹ پہاڑ "راکھ اور ننھے میاں جیسے افسانے لکھے۔ سماجی حقیقت پسندی کے تحت کوٹھی اور کوٹھری کمینی دلدل اور نیلم وغیرہ جیسے افسانے تخلیق کئے جن میں معاشرہ اور ماحول کی کجروی اپنی پوری خباشتوں کے ساتھ موجود ہے۔

افسانوی روایت میں ہاجرہ مسرور اپنی ایک الگ انفرادی رکھتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کے دیگر خواتین افسانہ نگاروں سے موضوع اور اسلوب دونوں پہلوؤں میں منفرد مقام بناتی ہیں۔ انہوں نے ہر دور کے مسائل کو افسانے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی حمایت بھی کی اور پاکستان جا کر نئے موضوعات کا احاطہ بھی کیا۔ موضوع سے قطع نظر ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا ایک نمایاں پہلو ان کا افسانوی اسلوب ہے۔ ہاجرہ چونکہ اودھ کی قصباتی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے ان کے افسانوں میں وہاں کی زبان کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے گھریلو زبان کو افسانے میں تحلیل کر کے تخلیقیت کی عمدہ مثال پیش کر دی۔ ان کے یہاں روز مرہ کے محاورے، کہاوتیں، جملے اور فقرے اتنی خوش اسلوبی سے بیان ہوئے ہیں کہ قاری ان کی نفرادیت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چونکہ وہ خود ایک عورت تھیں اور ان کے یہاں موضوعات بھی زیادہ تر عورت ذات سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اسلوب کی سطح پر افسانے میں عورت کے مخصوص نسائی لب و لہجے کو پروان چڑھایا۔ عورت ذات سے تعلق رکھنے والی ان کی طنز و تلخ زبان ان کے افسانوی اسلوب میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کی عرق ریزی سے قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ہاجرہ مسرور کے افسانے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہاجرہ مسرور نے موضوع اور فن دونوں کی سطح پر اردو افسانے کو آگے بڑھانے، پروان چڑھانے اور اس میں نئے نئے تجربات واحساسات کو داخل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے افسانے ہندوستان اور پاکستان دونوں معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ فکر و فن کا یہ شعوری تجربہ بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ انہوں نے اپنی مخصوص زبان، اسلوب، کرداروں کے انتخاب، معاشرے کے گہرے مشاہدے سے اپنی افسانوی دنیا بنائی ہے جس کی اپنی ایک الگ انفرادیت ہے۔

ناصر عباس نیر:

ناصر عباس نیر اردو زبان و ادب کے پاکستانی لکھاری، ممتاز نقاد، کالم نگار اور مضمون نگار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اردو سائنس بورڈ، لاہور کے ڈائریکٹر جنرل کے فرائض منصبی (۲۱ دسمبر ۲۰۱۶ء سے احسن طریقے سے انجام دیے۔ ان کی اُردو شاعری، ادبی تھیوریز اور مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں جیسے موضوعات پر بہت کی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے کچھ اہم کتب ساختیات اور پس جدیدیت پر بھی لکھی ہیں۔ بیسویں صدی کے اہم نظم گو شاعر مجید امجد ات ۱۹۷۴ء) کی شعریات پر

ISSN P : 3006-3329
ISSN E : 3006-3337
Vol.4 No.1 2026

۲۰۱۴ءاُن کی کتاب مجید امجد (حیات شعریات اور جمالیات) اپنے موضوع پر ان کا ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب اُس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں(۲۰۱۷)میرا جی کی نظم اور نثر کے مطالعات جدید اردو نظم اور میرا گی (۱۹۲۹۱۹۲ء) کے حوالے سے ایک قابل قدر تصنیف ہے۔

مابعد نو آبادیات کے اردو ادب پر اثرات کے حوالے اہم تصانیف مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں (۲۰۰۶)اور اردو ادب کی تشکیل جدید (۲۰۰۹)شائع ہوئیں۔ ناصر عباس نیر نے اُردو ادب میں ایک نئی تنقیدی زبان متعارف کرائی ہے جس میں نئی اصطلاحات کے باعث قارئین کو ابتدا میں ذرا دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ان سے شناسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ ان تحقیدی مضامین اور کتب کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پکھ سکتے ہیں۔ جدیدیت سے پس جدیدیت تک (۲۰۰۰) جدید اور مابعد جدید تنقید (۲۰۳) السانیات اور تنقید (۲۰۰۸) متن سیاق اور تناظر (۲۰۳)، عالمگیریت اور اردو (۲۰۱۵) ان کی مرتبہ کتاب ساختیات ایک تعارف (۲۰۱۱) ان کی نہایت اہم تنقیدی کتب ہیں۔

ناصر عباس نیر اردو کے مستند نقاد ہیں جنھوں نے نظریہ جدید اردو نظم، فکشن اور کلاسیکی نیز جدید اردو ادب کے مابعد نو آبادیاتی مطالعات کیے۔ ان کے اولین افسانوی مجموعہ خاک کی مہک (۲۰۱۲) کا منتظر عام پر آنا اردو زبان وادب کے قارئین کے لیے ایک خوشگوار انکشاف تھا۔ تنقید نگاری سے تخلیقی ادب کی جانب راغب ہونا ناصر عباس نیر کے نزدیک بے حد اہم ہے اور دو اسے اپنی ادبی فعالیت کی حیات نو قرار دیتے ہیں۔ اُن کے چند قریبی احباب کے علم میں ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۸۰ء کے آخر میں بطور افسانہ نگار ہی کیا تھا۔ اُن کی کچھ افسانوی کہانیاں معروف ادبی رسائل میں طبع بھی ہوئیں مگر پھر اپنے اساتذہ کے مشورے پر وہ سنجیدہ تخلیق یعنی تنقید نگاری کی جانب مائل ہو گئے۔

اُنھوں نے تنقید کے میدان میں ایک نئی دنیا کو دریافت کیا اور وہ نئی دنیا آزادی کی دنیا ہے سوال کرنے کی آزادی اور معانی متعین کرنے کے استفسارات کی آزادی کی دنیا ہے۔ مگر یہ دانشوری کی دنیا ہے جو ہماری کثیر جہتی وجودی زندگی کا محض ایک درجہ یا ایک حقہ ہے، جس کے زیر اہتمام ان کی فکشن سے محبت کی شاندار تجدید ہوئی۔ ایک تخلیق کار کا بیک وقت ممتاز تنقید نگار ثابت ہونا کوئی ایسی اچھنبے کی بات بھی نہیں کہ تخلیق اور تنقید کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس سے قبل بھی ایسی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ کئی مشرقی اور مغربی نقاد معروف تخلیق کار بھی تھے اور اس سے نہ صرف تنقید کو فائدہ ہوا بلکہ ادب میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ ناصر عباس نیر کے لیے بحیثیت ایک نقاد اُردو افسانے سے محبت کی حیات نو بالکل ایسے ہے جیسے کسی پرانے چاہنے والے کو گلے لگانا یا کسی بچھڑے ہوئے انسان سے دوبارہ ملاقات کا ہونا۔ اسی طرح اُنھوں نے اُردو فکشن میں نئی حیرتوں کی دنیا دریافت کی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناصر عباس نیر اُردو تنقید اور اُردو افسانہ دونوں محبتوں کو قائم رکھنے کے آرزومند ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان کے افسانوی مجموعے فرشتہ نہیں آیا(۲۰۱۷)اور راکھ سے لکھی گئی کتاب (۲۰۱۸ء) ہیں۔

بحیثیت ایک مستند نقاد ناصر عباس نیر کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بے حد دلچسپ معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ یہ ایک منفرد طرز کو ثابت کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کی کہانیاں صرف قاری کو اپنے ساتھ مصروف نہیں رکھتیں بلکہ اولا قاری کے دماغ میں حیرت اور اسرار پیدا کرتی ہیں اور پھر وہاں سکونت اختیار کر لیتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے مرکزی کرداروں کی کش مکش عمل اور جذبے کی نسبت کم قاری کے دماغ میں حل ہو جاتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں فرد واحد کے خود اپنی ذات کے ساتھ شدید دانشوارانہ وجودی خیالات کے تبادلے بھی ملتے ہیں جو ہمیں ایک طرح کی اصلاح کا راستہ دکھاتے ہیں۔ آج جس معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں وہاں ہر ظلم، ہر زیادتی عام ہو چکی ہے۔ یہاں معصوم بچے اپنی معصومیت سے بے دردی سے محروم کر دیے جاتے ہیں اور کوئی فرشتہ اُنھیں بچانے یا اُن کی مدد کو نہیں آتا۔ ناصر عباس نیر کا اشارہ ہماری اخلاقی گراوٹ اور بے رحمانہ حیوانیت کی جانب ہے جہاں بڑا سے بڑا ظلم ہو جائے خدا کا قہر ظالموں پر نہیں ٹوٹتا اور مظلوم کسی فرشتے کا انتظار ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کا یہ نمائندہ افسانہ جو اس افسانوی مجموعے کا عنوان قرار پایا ہے، پوری کائنات کی ناکامی کا نوحہ بنتا دکھائی دیتا ہے جہاں انسان بے رحم، مطلب پرست اور پتھر دل ہو چکا ہے اور یہاں فرشتے نہیں آتے۔ افسانہ "ہو سکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو، بھی اگر مکمل سچائی بیان نہیں کرتا تو چھوٹے چھوٹے حقائق کے نامختتم سلسلوں کا ایک حصہ ضرور ثابت ہوتا ہے۔ خواتین کی بے حرمتی کے واقعات حکومتی سخت قوانین کے باوجود بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب مجرم کو سرعام پھانسی دی جاتی ہے تو اس سے جرم ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں میں عبرت حاصل کرنے سے زیادہ نقل کا ماسے زیادہ نقل کا مادہ ہے، جو بڑی باتوں کی نقل کے سو طریقے دریافت کر لیتا ہے۔ لوگ ڈر سے جلد نجات پا جاتے ہیں مگر لذت کی خواہش سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

Vol.4 No.1 2026

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

> "وہ کچھ کچھ خود سے جھگڑتے محسوس ہوتے تھے، ایک کانٹے کو بستی کے ان نازک مقامات پر چبھتا محسوس کرتے تھے، جہاں زخم گہرا لگتا ہے، اور بھرتا بھی نہیں۔ میں ان کے اندر کی کھد بد کو ایک نا قابل برداشت دہشت تک پہنچانا چاہتا تھا..... میں انھیں اس آخری حد تک لے جانا چاہتا تھا، جہاں پہنچ کر تمام احساسات دہشت انگیز ہو جاتے ہیں...... اور جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگتے ہیں"۔(4)

ناصر عباس نیر چوں کہ ایک مستند نقاد ہیں اور بین الاقوامی تنقید اور ادب کے مطالعے پر اُن کی گرفت خاصی مضبوط ہے لہذا انھوں نے اپنے افسانوی تجربات میں بخوبی جدید تر ادبی اصطلاحات اور مختلف پیچیدہ تکنیکوں کو استعمال کیا ہے۔ جن کی تفہیم کچھ زیادہ آسان بھی نہیں۔ ان افسانوں کی تفہیم کے لیے ان کا مطالعہ ایک سے زائد بار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ حکمت و دانش سے لبریز کئی جملے ضرب الامثال کی مانند افسانوں کے بیچ میں نگینوں کی طرح آراستہ ہیں، جو افسانوں کی اثر انگیزی دوبالا کرتے ہیں۔ اپنے وطن اور اپنے وجود کی خاک سے محبت اور گہرے تعلق کی بازیافت کے ذریعے مختلف جدید تر تکنیکوں اور اسلوبیاتی تنوع کے ساتھ بنیادی انسانی وجودی سوالات تک رسائی کا حصول اور گہری انسانی نفسیاتی بصیرتوں اور سیاسی و سماجی مسائل کا ادراک اور ان کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا اور کسی ایک مخصوص بیانیہ اسلوب پر مرتکز نہ رہنا ناصر عباس نیر کی افسانہ نگاری کی خصوصیات ہیں، جن کے باعث انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ اُن کے افسانوں کی مجموعی فضا وجودی دانشوری سے تشکیل پذیر ہوئی ہے جو کہ عہدِ حاضر کے انسان کو درپیش مختلف سیاسی، اخلاقی اور سماجی مسائل اور اُس کے ذہنی خلفشار کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی اصلاح کی ذمہ داری بھی خود پر عائد کیے ہوئے ہے۔

رشید امجد:

رشید امجد ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر (کشمیر) کے محلہ شاہ نواب میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محی الدین اور والدہ کا نام خورشید بیگم تھا۔ غلام محی الدین کا خاندان کشمیر میں ہی آباد چلا آرہا تھا۔ سری نگر میں قالینوں کی ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ ان کا شعبہ ڈیزائننگ تھا۔ اپنی بھی ایک چھوٹی سی فیکٹری انھوں نے لگا رکھی تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ رشید امجد والدین کی شادی کے تقریباً بارہ سال بعد بڑی منتوں مرادوں کے ساتھ پیدا ہوئے۔ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ پانچ سال کی عمر میں انھیں برن ہال سرینگر میں داخل کروایا گیا۔

> "اس زمانے میں دیسی لوگوں میں سے کوئی کوئی ان مہنگے سکولوں میں پڑھنے کی سکت رکھتا تھا۔ والد صاحب نے ایک ٹانگہ خریدا تھا۔ جو انھیں سکول لانے لے جانے کے کام آتا تھا۔ دوپہر کا کھانا سکول ہی میں کھاتے تھے۔ یہ بڑی بے فکری اور امارت کے دن تھے۔ جس چیز پر بھی انگلی رکھتے، وہ ان کے لئے موجود ہوتی"۔(5)

رشید امجد کی افسانہ نگاری کا آغاز حقیقی موضوعات کی عکاسی سے ہوتا ہے۔"کاغذ کی فصیل جو پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ حقیقت نگاری کی ٹیکنیک میں لکھا گیا۔ بے زار آدم کے بیٹے جو علامتی حوالے سے متعارف ہونے والا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے بھی بعض افسانے حقیقت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن اپنے مشاہدے، تجربے اور وسیع مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے ایک نئی اور منفرد راہ اختیار کی۔ اس راہ میں نہ تو کسی کی تقلید ہے اور نہ روایت سے اس طرح انحراف کہ معاشرتی زندگی کی عکاسی اور اپنے عہد کے جدید تقاضوں کو فراموش کر دیا جاتا۔ بقول ڈاکٹر انور زاہدی:

> "رشید امجد نے بیانیہ افسانے کی مضبوط اور بے حد توانا روایت میں دراڑ ڈال کر نئی علامت گرمی سے اپنے معاشرے کی ایک نئی کہانی بیان کی۔ اور ایک ایسے سچ کو لفظوں کا روپ دیا۔ جسے گونگے اور بہرے معاشرے میں سننے اور سنانے کا حوصلہ ختم ہو چکا تھا"۔(6)

رشید امجد کی انفرادیت افسانے کی داخلی اور خارجی ساخت کے تعلق سے ایک نئی جہت سے ابھرتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں تہذیبی جڑوں کی تلاش کا عمل ہے۔ وہ روح انسانی کے اس حصے کی بازیافت اور تلاش میں سرگرداں ماضی کی نذر ہو گیا۔ رشید امجد کے افسانوں میں بنیادی مسئلہ عہد حاضر میں فرد کے وجود اور تشخص کا ہے۔ وہ شخص جو معاشرے کی داخلی اور خارجی چیرہ دستیوں کی نذر ہو رہا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ماضی کی اہمیت اساسی ہے۔ جبکہ رشید امجد ذات و کائنات کے انکشاف

میں ارض و سما کی وسعتوں کو کھنگالتے ہیں۔ یہاں وقت ہر قید سے آزاد ہے۔ ایک لمحہ موجود ہے۔ جو صدیوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور کئی زمانے اس لمحہ موجود میں سمٹ آتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں صوفیا کے ملفوظات اور اسالیب کا اثر نظر آتا ہے۔ جبکہ رشید امجد نے تصوف کی روایت کو مرشد کے کردار میں سمو کر اس دنیا کے اسرر ور موز کو برتا ہے۔ اس طرح رشید امجد انور سجاد کی فنی روایت سے بھی الگ نظر آتے ہیں۔

رشید امجد کی انفرادیت افسانے کی داخلی اور خارجی ساخت کے تعلق سے ایک نئی جہت سے ابھرتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں تہذیبی جڑوں کی تلاش کا عمل ہے۔ وہ روح انسانی کے اس حصے کی بازیافت اور تلاش میں سرگرداں ہیں۔ جو ماضی کی نذر ہو گیا۔ رشید امجد کے افسانوں میں بنیادی مسئلہ عہد حاضر میں فرد کے وجود اور تشخص کا ہے۔ وہ شخص جو معاشرے کی داخلی اور خارجی چیرہ دستیوں کی نذر ہو رہا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ماضی کی اہمیت اساسی ہے۔ جبکہ رشید امجد ذات و کائنات کے انکشاف میں ارض و سما کی وسعتوں کو کھنگالتے ہیں۔ یہاں وقت ہر قید سے آزاد ہے۔ ایک لمحہ موجود ہے۔ جو صدیوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور کئی زمانے اس لمحہ موجود میں سمٹ آتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں صوفیا کے ملفوظات اور اسالیب کا اثر نظر آتا ہے۔ جبکہ رشید امجد نے تصوف کی روایت کو مرشد کے کردار میں سمو کر اس دنیا کے اسرد ور موز کو برتا ہے۔ اس طرح رشید امجد انور سجاد کی فنی روایت سے بھی الگ نظر آتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنی علامتیں اور استعارے مغربی داستانوں اور اساطیری کرداروں سے لئے ہیں۔ انور سجاد کے برعکس رشید امجد اپنے زمانے، اس کے ردوبدل، اور تمام صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کا اپنا ہی معاشرہ ان کے سامنے ہے۔ انتظار حسین کا تجربہ ماضی کا ہے۔ جبکہ رشید امجد کے تجربوں اور مشاہدوں کے سوتے ان کے اپنے معاشرے سے ہی پھوٹتے ہیں۔ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ کا سفر خالدہ حسین کے افسانوں میں بھی ہے۔ وہاں بھی روحانی سکون کے لئے پیروں، فقیروں کی دنیا ہے۔ رشید امجد صرف اس دنیا کی تلاش ہی نہیں کرتے۔ بلکہ اس تلاش کے ساتھ وہ اپنے وجود کی تلاش اور اس کی ماری، روحانی اور آفاقی پہچان کو بھی پانے کے لئے سرگرداں ہیں۔

معاصر افسانے پر رشید امجد کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ مرتسم ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے سبب نئے افسانے کو پہنچنے کا خوب موقع ملا۔ اعجاز راہی اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ رشید امجد کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ افسانے کے اس ابتدائی سفر میں دونوں ایک دوسرے کے رفیق رہے۔ خارجی جبر کے اثرات اعجاز راہی کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے صورت حال فرق ہو جاتی ہے۔ کہ اعجاز راہی کو مارشل لاء کے جبر کا براہ راست سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لئے ان کے یہاں تجربہ مزید اذیت اور تلخی کے ساتھ ابھرا۔ مارشل لاء کا جبر اور قید و بند کی مشکلات کا ذکر ان کے معاصرین کے یہاں کم و بیش خارجیت سے متصادم ہونے کی ایک شدید کیفیت ہے۔ اس حوالے سے مسعود اشعر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے افسانوں میں زوال پذیری کے پس منظر میں تصویر میں دھندلا رہی ہیں۔ حقیقت معدوم ہوتی جاتی ہے۔ بے ربط اور بے معنی صورت حال جابجا موجود ہے۔ رشید امجد نے بھی ایسی ہی درپیش صورت حال کو برتا۔ لیکن اس انداز سے کہ اس بے ربطی اور بے اعتدالی میں نئے اسرار کے در کھلتے نظر آتے ہیں۔

سہ پہر کی خزاں اور پت جھڑ میں خود کلامی کے تمام افسانے جو کم و بیش ایسی ہی صورت حال میں لکھے گئے۔ عہد زوال کی تصویروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ غور و فکر کی سعی اور شعور کی جنہیں کھلتی جاتی ہیں۔ غور و فکر کی یہ بھی مقامی حوالوں کے ساتھ مل کر ان کی انفرادیت قائم کرتی ہے۔ رشید امجد کی کہانی کا انسان جبر کی تمام قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ جن کے اندر زندگی حوصلہ مندی کے ساتھ بسر کرنے کا نام ہے۔ رشید امجد کے افسانوں کے موضوعات، فکری اور تخیلی عناصر اور کرداروں کی فلسفیانہ گفتگو کا تحرک، یہی فلسفہ وقت ہے۔ مثبت متحرک، محدود سے لامحدود زندگی کے لامتناہی سلسلوں کا امین۔ یہ نکتہ سائنسی توجیہہ کا آئینہ دار بھی ہے۔ رشید امجد کے ان نظریات کا حوالہ اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے موضوعات کی فکری سطحیں ابھی نمایاں بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ ان کی تعمیر و تشکیل میں خاندانی وراثت کے بظاہر کوئی براہ راست اثرات مرتب ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ زندگی، ماحول، اس کے خارج اور باطن کا وہ مطالعہ ہے جو ان کی منفرد اور مخصوص طرز فکر کا عکاس ہے۔ یہاں ان کے تجربے، مشاہدے، بصیرت، بصارت اور کشف کی داخلی وارداتیں ہیں۔ ان کے موضوعات، کردار اور زبان و بیان میں یہ تمام محرکات اور ان کی فکری لہریں برقی رو کی مانند رواں دواں ہیں۔ یہ برقی رو، روایت، تجربے، مشاہدے اور تخیل کی قوت سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر انور سدید، "اُردو ادب کی تحریکیں"، انجمن ترقی اردو، لاہور، پاکستان، 1985ء، ص:63

2۔ اسد محمد خان، "یادیں"، سہ ماہی کراچی، جلد نمبر 9، شمارہ نمبر 17، فروری 2008ء، ص:36

3۔ "نقوش" شخصیات نمبر، مدیر محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو لاہور، 1955ء، ص:665

4۔ ناصر عباس نیر، "فرشتہ نہیں آیا"، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء، ص:65

5۔ رشید امجد، "تمنا بے تاب"، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راولپنڈی، ستمبر 2001ء، ص:9،8

6۔ ایضاً، ص:10